تفہیم القرآن

(٦)

آل عمران

(از رکوع ۱ تا رکوع ۹)

اس سورۃ میں ایک مقام پر "آل عمران" کا ذکر آیا ہے۔ اسی کو علامت کے طور پر اس کا نام قرار دے دیا گیا ہے۔

اس میں چار تقریریں شامل ہیں۔ پہلی تقریر آغاز سورۃ سے چوتھے رکوع کی ابتدائی دو آیتوں تک ہے اور وہ غالباً جنگ بدر کے بعد قریبی زمانہ ہی میں نازل ہوئی ہے۔ دوسری تقریر آیت اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (اللہ نے آدم اور نوح اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر اپنی رسالت کے کام کے لیے منتخب کیا تھا) سے لے کر چھٹے رکوع کے اختتام تک ۹ھ میں وفد نجران کے موقع پر نازل ہوئی۔ تیسری تقریر ساتویں رکوع کے آغاز سے لے کر بارھویں رکوع کے اختتام تک چلتی ہے اور اس کا زمانہ پہلی تقریر سے متصل ہی معلوم ہوتا ہے۔ چوتھی تقریر تیرھویں رکوع سے ختم سورۃ تک جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ ان مختلف تقریروں کو ملا کر جو چیز ایک مسلسل مضمون بناتی ہے وہ مقصد و مدعا اور مرکزی مضمون کی یکسانیت ہے۔ سورۃ کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے، ایک اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی ہے جس کا سلسلہ سورۃ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ ان کی اعتقادی

گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ یہ رسول اور یہ قرآن اُسی دین کی طرف بلا رہا ہے جس کی دعوت شروع سے تمام انبیاء دیتے چلے آئے ہیں اور جو فطرۃ اللہ کے مطابق ایک ہی دین حق ہے۔ اس دین کے سیدھے رستہ سے ہٹ کر جو راہیں تم نے اختیار کی ہیں وہ خود اُن کتابوں کی رو سے بھی صحیح نہیں ہیں جن کو تم کتب آسمانی تسلیم کرتے ہو۔ لہٰذا اس صداقت کو قبول کرو جس کے صداقت ہونے سے تم خود بھی انکار نہیں کر سکتے۔ دوسرے گروہ کو، جواب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اُسی سلسلہ میں مزید ہدایات دی گئی ہیں جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا۔ انھیں پچھلے انبیاء کی امتوں کے مذہبی و اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ دکھا کر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان راہوں پر چلنے سے بچیں، انھیں بتایا گیا ہے کہ ایک مصلح جماعت ہونے کی حیثیت سے وہ کس طرح کام کریں اور اُن اہل کتاب اور منافق مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریں جو خدا کے راستے میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈال رہے ہیں، اور انھیں اپنی اُن کمزوریوں کی اصلاح پر متوجہ کیا گیا ہے جن کا ظہور جنگ اُحد کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ اس طرح یہ سورۃ نہ صرف آپ اپنے مختلف اجزاء میں مسلسل و مربوط ہے بلکہ سورۂ بقرہ کے ساتھ بھی اس کا ایسا قریبی تعلق نظر آتا ہے کہ یہ بالکل اس کا تتمہ معلوم ہوتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا فطری مقام بقرہ سے متصل ہی ہے۔

سورۃ کا تاریخی پس منظر یہ ہے :

(۱) سورۂ بقرہ میں اِس دینِ حق پر ایمان لانے والوں کو جن آزمائشوں اور مصائب و مشکلات سے قبل از وقت متنبہ کر دیا گیا تھا وہ پوری شدت کے ساتھ پیش آ چکی تھیں۔ جنگ بدر میں اگرچہ اہل ایمان کو فتح حاصل ہوئی تھی لیکن یہ جنگ گویا بھڑوں کے چھتے میں پتھر مارنے کی ہم معنی تھی۔ اس اولین مسلح مقابلہ نے عرب کی اُن سب طاقتوں کو چونکا دیا تھا جو اس نئی تحریک سے عداوت رکھتی تھیں۔ ہر طرف طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے تھے، مسلمانوں پر ایک دائمی خوف اور بے اطمینانی کی حالت طاری تھی،

اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مدینہ کی یہ چھوٹی سی بستی جس نے گردو پیش کی ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی تھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالی جائے گی۔ اِن حالات کا مدینہ کی معاشی حالت پر بھی نہایت بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ اول تو ایک چھوٹے سے قصبہ میں جس کی آبادی چند سو گھروں سے زیادہ نہ تھی، یکایک مہاجرین کی ایک بڑی تعداد کے آجانے سے ہی معاشی توازن بگڑ چکا تھا، اس پر مزید مصیبتِ اس حالتِ جنگ کی وجہ سے نازل ہوگئی۔

(۲) ہجرت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطرافِ مدینہ کے یہودی قبائل کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، اِن لوگوں نے اُن معاہدات کا ذرہ برابر پاس نہ کیا۔ جنگِ بدر کے موقع پر اِن اہلِ کتاب کی ہمدردیاں توحید و نبوت اور کتاب و آخرت کے ماننے والے مسلمانوں کے بجائے بُت پوجنے والے مشرکین کے ساتھ تھیں۔ بدر کے بعد یہ لوگ کھلم کھلا قریش اور دوسرے قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف جوش دلا دلا کر بدلہ لینے پر اُکسانے لگے۔ خصوصاً بنی نضیر کے سردار کعب بن اشرف نے تو اِس سلسلہ میں اپنی مخالفانہ کوششوں کو اندھی عداوت، بلکہ کمینہ پن کی حد تک پہنچا دیا۔ اہلِ مدینہ کے ساتھ اِن یہودیوں کے ہمسائگی اور دوستی کے جو تعلقات صدیوں سے چلے آرہے تھے ان کا پاس و لحاظ بھی انھوں نے اٹھا دیا تھا۔ آخر کار جب اُن کی شرارتیں اور عہد شکنیاں حدِ برداشت سے گزر گئیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چند مہینے بعد بنی قَیْنُقاع پر، جو اِن یہودی قبیلوں میں سب سے زیادہ شر پسند تھا، حملہ کر دیا اور اُنھیں اطرافِ مدینہ سے نکال باہر کیا۔ لیکن اس سے دوسرے یہودی قبائل کی آتشِ عناد اور زیادہ بھڑک اٹھی، انھوں نے مدینہ کے منافق مسلمانوں اور حجاز کے مشرک قبیلوں کے ساتھ ساز باز کر کے اسلام اور مسلمانوں کے لیے ہر طرف خطرات ہی خطرات پیدا کر دیے۔ حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ کی جان کے متعلق ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ نہ معلوم کب آپ پر قاتلانہ حملہ ہو جائے۔ صحابۂ کرام اس زمانہ میں بالعموم ہتھیار بند ہو تے تھے، شبخون کے ڈر سے راتوں کو پہرے دیے جاتے تھے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں نگاہوں سے

اوجھل ہو جاتے تو صحابہ کرام گھبرا کر آپ کی ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے تھے۔

(۳) بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں آپ ہی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی کہ اس پر مزید تیل یہودیوں نے چھڑکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی سال بعد مکہ سے تین ہزار کا لشکر جرار مدینہ پر حملہ آور ہو گیا اور اُحد کے دامن میں وہ لڑائی پیش آئی جو جنگِ اُحد کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ سے نکلے تھے مگر راستہ میں سے تین سو منافق یکایک الگ ہو کر مدینہ کی طرف پلٹ گئے اور جو سات سو آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی پارٹی شامل رہی جس نے دورانِ جنگ میں مسلمانوں کے درمیان فتنہ برپا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے کثیر التعداد مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔

(۴) جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیر و کا ایک بڑا حصہ تھا لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا، اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ تازہ ہی بنی تھی جس کی اخلاقی تربیت ابھی تکمیل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دوسرا ہی موقع پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض کمزوریوں کا ظہور بھی ہوتا۔ اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کے بعد اس کی پوری سرگزشت پر ایک مفصل تبصرہ کیا جائے اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے اندر پائی گئی تھیں ان میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق ہدایات دی جائیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات نظر میں رکھنے کے لائق ہے کہ اس جنگ پر قرآن کا تبصرہ اُن تبصروں سے کتنا مختلف ہے جو دنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا کرتے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

آ، ل، م۔ اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو نظامِ کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

اُس نے تم[۱] پر یہ کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے[۲] اور اُن کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اِس سے پہلے اُس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے توراۃ اور انجیل نازل کی تھیں۔ نیز حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز بھی اس نے نازل فرمائی۔ اب جو لوگ اُس کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور بُرائی کا بدلہ دینے والا ہے۔

زمین اور آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں[۳]، وہی تو ہے جو تمھاری ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے[۴]۔ اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا

---

[۱] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

[۲] یعنی یہ کتاب سراسر علمِ حق پر مشتمل ہے۔ اس میں باطل اور جھوٹ کی کوئی آمیزش نہیں ہے، اس کے بیانات میں سے کوئی چیز قیاس اور گمان اور اندازے پر مبنی نہیں ہے، اس میں کہیں نظر و رائے اور فیصلہ کی غلطی کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، ہر معاملہ میں یہ جو کچھ کہتی ہے حق ہی کہتی ہے۔

[۳] یعنی وہ کائنات کی تمام حقیقتوں کا جاننے والا ہے، لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہو وہ سراسر حق ہی ہونی چاہیے۔ بلکہ خالص حق صرف اُسی کتاب میں انسان کو میسر آسکتا ہے جو اس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔

[۴] اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ کہ تمھاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے نہ تم خود جان سکتے ہو، لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کیے بغیر تمھارے لیے چارہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس نے تمھارے استقرارِ حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمھاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا، کس طرح ممکن تھا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمھاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو تو وہ یہی ہے۔

نہیں ہے۔ وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں[۵۱]، اور دوسری متشابہات[۵۲]۔ جن لوگوں کے دلوں

---

۵۱ محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ "آیاتِ محکمات" سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں جنھیں تاویلات کا تختۂ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات "کتاب کی اصل بنیاد ہیں"، یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے، انھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، انھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے، انہی میں دین کے بنیادی اُصول بیان کیے گئے ہیں، انہی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیاتِ محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرۃً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

۵۲ متشابہات = وہ جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے ــــ یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں نہ آسکتی ہیں، جن کو نہ اس نے کبھی دیکھا نہ چھوا نہ چکھا، اُن کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انہی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیبِ بیان مل سکتے ہیں جن سے ہر سامع کے ذہن میں اُن کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیبِ بیان وہ استعمال کیے جائیں جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن میں ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں یہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں ٹیڑھ ہے وہ فتنہ کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ اُن کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں"۔ اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ یہ اہلِ ایمان اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ "مالک! جبکہ تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے تو اب کہیں ہمارے دلوں کو پھر کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تو ہرگز اپنے وعدہ سے ٹلنے والا نہیں ہے"۔ ع ۱

جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے انھیں اللہ کے مقابلہ میں نہ مال کچھ کام دیگا

(بقیہ صفحہ سابق) تک پہنچا دے یا اس کا ایک دھندلا سا تصور پیدا کر دے، ورنہ اس کے مفہوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا حتیٰ کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوقِ نضول نہیں رکھتے وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اُس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جو ہوتے ہیں ان کا تمام تر شغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم جانتے ہی نہیں تو ان پر ایمان کیسے لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے۔ اور جب آیات محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ جہاں تک ان کا سیدھا سادہ مفہوم اس کی سمجھ میں آجاتا ہے اس کو وہ لے لیتا ہے، اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے وہاں کھوج لگانے اور موشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مجمل ایمان لا کر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

نہ اولاد، وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ اُن کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور اُن سے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انھوں نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انھیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ پس جن لوگوں نے تمہاری ؎۱ دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اُن سے کہدو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور جہنم بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمہارے ؎۲ لیے اُن دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم سر دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے۔ مگر (نتیجہ نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے ؎۳۔

؎۱ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

؎۲ یہ خطاب عام منکرین سے ہے جن میں اہلِ کتاب، مشرکینِ عرب اور منافقین سب شامل ہیں۔

؎۳ جنگِ بدر کا واقعہ اُس وقت قریبی زمانہ ہی میں پیش آچکا تھا اس لیے اس کے مشاہدات و نتائج کی طرف اشارہ کر کے لوگوں کو عبرت دلائی گئی ہے۔ اس جنگ میں تین باتیں نہایت سبق آموز تھیں:-

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے ایک دوسرے کے بالمقابل آئے تھے اس سے دونوں کا اخلاقی فرق صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دَور چل رہے تھے، ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں، اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی، اور دوسری طرف مسلمانوں کے لشکر میں پرہیزگاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجہ کا اخلاقی انضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے، بات بات پر خدا کا نام تھا اور خدا ہی کے آگے دعائیں اور التجائیں تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ دونوں میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ مسلمان اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود کفار کی بڑی اور بہتر اسلحہ رکھنے والی

(باقی اگلے صفحہ پر)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو، میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں اُن کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی، اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویہ پر گہری نظر رکھتا ہے[۵۱]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ "مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے"۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں[۵۲]، راستباز، فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے[۵۳]، اور فرشتے

(بقیہ صفحہ سابق) فوج کے مقابلہ میں جس طرح کامیاب ہوئے اس سے صاف معلوم ہوگیا تھا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

تیسرے یہ کہ اللہ کی غالب طاقت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سروسامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پھولے ہوئے تھے ان کے لیے یہ واقعہ ایک تازیانہ تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینہ کے کاشتکاروں کی ایک مُٹھی بھر جماعت کے ذریعہ سے قریش جیسے قبیلہ کو شکست دلوا سکتا ہے جو تمام عرب کا سرتاج تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی اللہ غلط بخش نہیں ہے، نہ سرسری اور سطحی طور پر فیصلہ کرنے والا ہے، بلکہ بندوں کے اعمال و افعال اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو خوب جانتا ہے اور اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں میں سے کون اِس انعام کا واقعی مستحق ہے۔

[۵۲] یعنی راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہیں، کسی نقصان یا مصیبت سے ہمّت نہیں ہارتے، کسی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں[16] کہ اُس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے[17]۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے اُن لوگوں نے اختیار کیے جنھیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرزِ عمل

(بقیہ صفحہ سابق) ناکامی سے دل شکستہ نہیں ہوتے، کسی لالچ سے پھسل نہیں جاتے، اور ایسی حالت میں بھی حق کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں جبکہ بظاہر اُس حق کی کامیابی کا کوئی امکان نظر نہ آتا ہو۔

[15] یعنی اللہ جو کائنات کی تمام حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے، جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، یہ اُس کی شہادت ہے ـــ اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی ـــ کہ پورے عالمِ وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو الوہیت کی صفات سے متصف ہو، الوہیت کے اقتدار کی مالک ہو، اور الوہیت کے حقوق کی مستحق ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [16] اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے کیونکہ وہ سلطنتِ کائنات کے انتظامی اہلکار ہیں، اور وہ براہِ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں۔ اس کے بعد مخلوقات میں سے جن لوگوں کو بھی حقائق کا تھوڑا یا بہت علم حاصل ہوا ہے اُن سب کی ابتدائے آفرینش سے آج تک یہ متفقہ شہادت رہی ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا مالک و مدبّر ہے۔

[17] یعنی اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح و درست ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک و معبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی و غلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے، اور اس کی بندگی بجا لانے کا طریقہ خود ایجاد کرے بلکہ اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے جو ہدایت بھیجی ہے، ہر کمی و بیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر و عمل کا نام "اسلام" ہے اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق و مالک اپنی مخلوق اور رعیت کے لیے اسلام کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریت سے لے کر شرک و بت پرستی تک ہر نظریے اور ہر مسلک کی پیروی کا جائز حقدار سمجھ سکتا ہے، مگر فرمانروائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے۔

کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انھوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔[۵] اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو ان سے کہو "میں نے اور میرے پیرووں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے"۔ پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟[۶] اگر کی تو وہ راہ راست پا گئے، اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملہ کو دیکھنے والا ہے۔ ع۲

جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لیے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔[۷] یہ وہ لوگ ہیں جن کے

---

۵ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو پیغمبر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے اس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے اس اصل دین کو مسخ کر کے اور اس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب نوع انسانی میں رائج کیے گئے ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیاز حاصل کرنے چاہے اور اپنی خواہشات کے مطابق اصل دین کے عقائد، اصول اور احکام میں ردو بدل کر ڈالا۔

۶ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ "میں اور میرے پیرو تو اس ٹھیٹھ اسلام کے قائل ہیں جو خدا کا اصل دین ہے۔ اب تم بتاؤ کہ آیا تم اپنے اور اپنے اسلاف کے بڑھائے ہوئے حاشیوں کو چھوڑ کر اس اصلی و حقیقی دین کی طرف آتے ہو؟

۷ یہ طنزیہ انداز بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جن کرتوتوں پر وہ آج بہت خوش ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہم بہت خوب کام کر رہے ہیں انھیں بتا دو کہ تمھارے ان اعمال کا انجام یہ ہے۔

اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں ضائع ہوگئے، اور ان کا مددگار کوئی نہیں ہے۔[51]
تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے اُن کا حال کیا ہے؟ اُنھیں جب کتابِ الٰہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن کے درمیان فیصلہ کرے[52]، تو اُن میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اِس فیصلہ کی طرف آنے سے منہ پھیر جاتا ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں آتشِ دوزخ تو ہمیں مَس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز[53]۔ اُن کے خودساختہ عقیدوں نے اُن کو اپنے دین کے معاملہ میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی اُن پر جب ہم انھیں اُس روز جمع کریں گے

۵۱؎ "اُن کے اعمال ضائع ہوگئے" یعنی ان سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، انھوں نے اپنی قوتیں اور کوششیں ایسی راہ میں صرف کر دیں جس کا نتیجہ دنیا میں بھی خراب ہے اور آخرت میں بھی خراب۔ "اور اُن کا کوئی مددگار نہیں" یعنی کوئی طاقت ایسی نہیں جو ان کی اس غلط سعی و عمل کو پھل بنا سکے، یا کم از کم بدانجامی ہی سے بچا سکے۔ جن جن قوتوں پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کے کام آئیں گی ان میں سے فی الواقع کوئی بھی ان کی مددگار ثابت نہ ہوگی۔

۵۲؎ یعنی اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کو آخری سند مان لو، اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دو، اور جو کچھ اُس کی رو سے حق ثابت ہو اُسے حق اور جو اس کی رو سے باطل ثابت ہو اُسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد توراۃ یا انجیل ہے اور "کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ پانے والوں" سے مراد یہود و نصاریٰ کے علما ہیں۔

۵۳؎ یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کا چہیتا سمجھ بیٹھے ہیں، یا اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال جنت ہماری ہے، ہم اہلِ ایمان ہیں، ہم فلاں کی اُمت اور فلاں کے مرید اور فلاں کے دامن گرفتہ ہیں، بھلا دوزخ کی کیا مجال کہ ہمیں چھو جائے، اور بالفرض اگر ہم دوزخ میں ڈالے بھی گئے تو بس چند روز وہاں رکھے جائیں گے تاکہ گناہوں کی جو آلائش لگ گئی ہے وہ صاف ہو جائے، پھر سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔ اسی قسم کے خیالات نے ان کو اتنا جری و بے باک بنا دیا ہے کہ وہ سخت سے سخت جرائم کا ارتکاب کر جاتے ہیں، بدترین گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، کھلم کھلا حق سے انحراف کرتے ہیں اور ذرا خدا کا خوف ان کے دل میں نہیں آتا۔

جس کا آنا یقینی ہے! اُس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

کہو، خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو، اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے[۱]۔

مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور ہمساز ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ[۲]، مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اُسی کی طرف پلٹ کر

---

۱ جب انسان ایک طرف کافروں اور نافرمانوں کے کرتوت دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھتا ہے کہ وہ دنیا میں کس طرح پھل پھول رہے ہیں، ایک طرف اہلِ ایمان کی اطاعت شعاریاں دیکھتا ہے اور دوسری طرف ان کو اس فقر و فاقہ اور ان مصائب و آلام کا شکار دیکھتا ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام ۱۳ھ اور اس کے لگ بھگ زمانہ میں مبتلا تھے، تو قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک عجیب حسرت آمیز استفہام گردش کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اُسی استفہام کا جواب دیا ہے اور ایسے لطیف پیرایہ میں دیا ہے کہ اس سے زیادہ لطافت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲ یعنی اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہو اور اُسے اُن کے ظلم و ستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہی میں کا ایک آدمی ہے، یا اگر اس کا مسلمان ہونا ظاہر ہو گیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لیے وہ کفار کے ساتھ دوستانہ رویہ کا اظہار بھی کر سکتا ہے حتیٰ کہ شدید خوف کی حالت میں، جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمۂ کفر تک کہہ جانے کی رخصت ہے۔

جانتا ہے^{۵۱} ۔ اے نبی، لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے اُسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہر حال اُسے جانتا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اُس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی۔ اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اُس سے بہت دور ہوتا! اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیرخواہ ہے^{۵۲} ع ۳

اے نبی، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔" اُن سے کہو کہ "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو۔" پھر اگر وہ تمھاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور

---

۵۱ یعنی کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا نہ چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمھاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں مگر خدا تمھیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے اگر بدرجۂ مجبوری کبھی کفار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اِس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کی جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تمھاری جان و مال کا تحفظ ہو جائے اور کفر یا کافروں کی کوئی حقیقی خدمت تمھارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلہ میں کفر کو فروغ حاصل ہونے کا امکان ہو۔ ورنہ خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے تم نے اللہ کے دین کو یا اہلِ ایمان کی جماعت کو یا کسی ایک فردِ مومن کو بھی نقصان پہنچایا، یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی تو اللہ کے محاسبے سے ہرگز نہ بچ سکو گے۔ جانا تم کو بہر حال اُسی کے پاس ہے۔

۵۲ یعنی یہ اس کی انتہائی خیرخواہی ہے کہ وہ تمھیں قبل از وقت ایسے اعمال پر متنبہ کر رہا ہے جو تمھارے انجام کی خرابی کے موجب ہو سکتے ہیں۔

اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں[۵۴]۔

اللہ[۵۵] نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران[۵۶] کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لیے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلہ کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[۵۷]۔ (وہ اس وقت سن رہا تھا) جب عمران کی

---

[۵۴] یہاں پہلی تقریر ختم ہوتی ہے۔ اس کے مضمون، خصوصاً جنگِ بدر کی طرف جو اشارہ اس میں کیا گیا ہے اس کے انداز پر غور کرنے سے غالب قیاس یہی ہوتا ہے کہ اس تقریر کے نزول کا زمانہ جنگِ بدر کے بعد اور جنگِ اُحد سے پہلے کا ہے، یعنی ۳ھ ہجری۔ محمد بن اسحاق کی روایت سے عموماً لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اس سورۃ کی ابتدائی ۸۰ آیتیں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن اول تو اِس تمہیدی تقریر کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ یہ اس سے بہت پہلے نازل ہوئی ہوگی۔ دوسرے مقاتل بن سلیمان کی روایت میں تصریح ہے کہ وفدِ نجران کی آمد پر صرف وہ آیات نازل ہوئی ہیں جو حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے بیان پر مشتمل ہیں اور جن کی تعداد ۳۰ یا اس سے کچھ زائد ہے۔

[۵۵] یہاں سے دوسرا خطبہ شروع ہوتا ہے جس کے نزول کا زمانہ ۹ھ ہجری ہے جب کہ نجران کی عیسائی جمہوریت کا وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے اُس وقت اس علاقہ میں ۷۳ بستیاں شامل تھیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ ۲۰ ہزار قابلِ جنگ مرد اس میں سے نکل سکتے تھے۔ آبادی تمامتر عیسائی تھی اور تین سرداروں کے زیرِ حکم تھی، ایک عاقب کہلاتا تھا جس کی حیثیت امیرِ قوم کی تھی، دوسرا سید کہلاتا تھا جو ان کے تمدنی و سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا، اور تیسرا اسقف تھا جس سے مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور تمام اہلِ عرب کو یقین ہو گیا کہ ملک کا مستقبل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے تو عرب کے مختلف گوشوں سے آپ کے پاس وفد آنے شروع ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں نجران کے تینوں سردار بھی ۶۰ آدمیوں کا ایک وفد لے کر مدینہ پہنچے۔ جنگ کے لیے بہرحال وہ تیار نہ تھے۔ اب سوال صرف یہ تھا کہ آیا وہ اسلام قبول کرتے ہیں یا ذمّی بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ خطبہ نازل کیا تاکہ اِس کے ذریعہ سے وفدِ نجران کو اسلام کی طرف (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

عورت[۳۲] کہہ رہی تھی کہ "میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں، وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا، میری اس پیش کش کو قبول فرما، تو سننے اور جاننے والا ہے[۳۳]۔ پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا "مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی۔ "اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا[۳۴]۔ خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں"۔ آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرمالیا، اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا، اور زکریاؑ کو اس کا سرپرست بنا دیا۔

(بقیہ سابق) دعوت دی جائے۔

[۳۰] حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمران تھا اور آل عمران سے مراد وہ انبیاء بنی اسرائیل ہیں جو حضرت موسیٰ و ہارون سے لے کر حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ تک پیدا ہوئے۔

[۳۱] مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ مسیح کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا اور الوہیت میں اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بنیادی غلطی رفع ہو جائے تو اسلام صحیح و خالص کی طرف ان کا پلٹنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر خطبہ کی تمہید یوں اٹھائی گئی ہے کہ آدم اور نوح اور نسل عمرانی کے سب پیغمبر انسان تھے، ایک کی نسل سے دوسرا پیدا ہوتا چلا آیا، ان میں سے کوئی الٰہ نہ تھا، بس ان کی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ نے اپنے دین کی تبلیغ اور دنیا کی اصلاح کے لیے ان کو منتخب فرمایا تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۳۲] اگر عمران کی عورت سے مراد "عمران کی بیوی" لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ وہ عمران نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، بلکہ یہ حضرت مریم کے والد تھے اور ان کا نام بھی عمران تھا۔ اور اگر عمران کی عورت سے مراد آلِ عمران کی عورت لی جائے تو دونوں جگہ عمران سے دو الگ شخصیتیں مراد لینے کی ضرورت نہ رہے گی لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعۂ معلومات نہیں ہے جس سے ہم قطعی طور پر دونوں معنوں میں سے ایک کو ترجیح دے سکیں کیونکہ اس کا انحصار یہ ثابت ہو جانے پر ہے کہ حضرت مریم کے والد کا نام واقعی عمران تھا، یا نہیں تھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب[۱] میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر زکریا[۲] نے اپنے رب سے پکارا "پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا سننے والا ہے"۔ جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ "اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان[۳] کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا، اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی،

(بقیہ سابق) ۳۲ یعنی تو اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور ان کی نیتوں کے حال سے واقف ہے۔

۳۳ یعنی لڑکا ان بہت سی فطری کمزوریوں اور تمدنی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے جو لڑکی کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہیں لہٰذا اگر لڑکا ہوتا تو وہ مقصد زیادہ اچھی طرح حاصل ہو سکتا تھا جس کے لیے میں اپنے بچے کو تیری راہ میں نذر کرنا چاہتی تھی۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱ اب اُس وقت کا ذکر شروع ہوتا ہے جب حضرت مریم سنِ رشد کو پہنچ گئیں اور بیت المقدس کی عبادتگاہ (ہیکل) میں داخل کر دی گئیں اور ذکر الٰہی میں شب و روز مشغول رہنے لگیں۔

لفظ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اُس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اہل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر حجرے بنائے جاتے ہیں، جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام، اور معتکف لوگ رہا کرتے ہیں انھیں محراب کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کے کمروں میں سے ایک میں حضرت مریم معتکف رہتی تھیں۔

۲ حضرت زکریا اس وقت تک بے اولاد تھے۔ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرۃً ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش اللہ انھیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کرے، اور یہ دیکھ کر کہ اللہ کس طرح اپنی قدرت سے اس گوشہ نشین لڑکی کو رزق پہنچا رہا ہے انھیں یہ امید ہوئی کہ اللہ چاہے تو اس بڑھاپے میں بھی اُن کو اولاد دے سکتا ہے۔

۳ اللہ کے فرمان سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چونکہ ان کی پیدائش (باقی اگلے صفحہ پر)

کمال درجہ کا ضابط ہوگا، نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا"۔ زکریّا نے کہا "پروردگار بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا، میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے"۔ جواب ملا "ایسا ہی ہوگا[1]، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ عرض کیا "مالک پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے[2]"۔ کہا "نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کروگے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد
کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا[3]۔ ۴ع

پھر وہ وقت آیا جب مریم سے فرشتوں نے آکر کہا "اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریم اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک"۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ

(بقیہ سابق) اللہ تعالیٰ کے ایک غیر معمولی فرمان سے خرقِ عادت کے طور پر ہوئی تھی اس لیے ان کو قرآن مجید میں "کلمة من اللہ" کہا گیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی تیرے بڑھاپے اور تیرے بانجھ پن کے باوجود اللہ تجھے بیٹا دے گا۔

[2] یعنی ایسی علامت بتا دے کہ جب ایک پیرِ فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اطلاع مجھے پہلے سے ہو جائے۔

[3] اس تقریر کا اصل مقصد عیسائیوں پر ان کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ بیچ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام کی ولادت معجزانہ طریقہ سے ہوئی تھی اسی طرح ان سے چھ مہینہ پہلے ہی حضرت یحییٰ کی پیدائش بھی ایک دوسری طرح کے معجزے سے ہو چکی تھی۔ اس سے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اگر یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیح محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں۔

بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہو اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اُس وقت حاضر تھے جب اُن کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔ اور جب فرشتوں نے کہا "اے مریم! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابنِ مریم ہوگا، دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا" یہ سُن کر مریم بولی "پروردگار! میرے ہاں بچہ کہاں سے ہوگا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا" جواب ملا "ایسا ہی ہوگا"[1]، اللہ

---

[1] یعنی باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا، تیرے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی لفظ کذالک (ایسا ہی ہوگا) حضرت زکریا کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہیے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنی کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ ورنہ اگر بات یہی تھی کہ حضرت مریم کے ہاں اُسی معروف فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا جس طرح دنیا میں عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ کی پیدائش فی الواقع اسی طرح ہوئی ہوتی تو یہ سارا بیان قطعی مہمل ٹھیرتا ہے جو چوتھے رکوع سے چھٹے رکوع تک چلا جا رہا ہے اور وہ تمام بیانات بھی بے معنی قرار پاتے ہیں جو ولادت مسیح کے باب میں دوسرے مقامات پر ہمیں ملتے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو الٰہ اور ابن اللہ اسی وجہ سے مانا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی اور یہودیوں نے حضرت مریم پر تہمت اسی وجہ سے لگائی تھی کہ علانیہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک لڑکی غیر شادی شدہ ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا بالکل کافی ہو جاتا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو، وہ لڑکی شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا، اور اُسی کے نطفے سے عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ یہ مختصر سی دو ٹوک بات کہنے کے بجائے آخر اتنی لمبی تمہیدیں اُٹھانے اور پیچ در پیچ باتیں کرنے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کے بجائے مسیح بن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی جس سے بات سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ جاتے۔ پس جو لوگ قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت (باقی اگلے صفحہ پر)

جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، وہ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔" (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلۂ کلام میں کہا" اور اللہ اُسے کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا، توراۃ اور انجیل کا علم سکھائے گا اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔ (اور وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل سے کہے گا کہ) میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جائے گا۔ میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر سکتا ہوں اور مردے کو زندہ کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو[۵۱]۔ اور میں اُس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو توراۃ میں سے اِس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے[۵۲] اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو

(بقیہ صفحہ سابق) کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت حسبِ معمول باپ و ماں کے اتصال سے ہوئی تھی وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اظہار ما فی الضمیر اور بیانِ مدعا کی اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں (معاذ اللہ)۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دلانے کے لیے کافی ہیں کہ میں اُس خدا کا بھیجا ہوا ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکمِ ذی اقتدار ہے، بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار ہو، ہٹ دھرم نہ ہو۔

[۵۲] یعنی یہ میرے فرستادۂ خدا ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ اگر میں اُس کی طرف سے بھیجا ہوا نہ ہوتا بلکہ جھوٹا مدعی ہوتا تو خود ایک مستقل مذہب کی بنا ڈالتا اور اپنے ان کمالات کے زور پر تمہیں سابق دین سے ہٹا کر اپنے ایجاد کردہ دین کی طرف لانے کی کوشش کرتا، لیکن میں تو اُسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی تعلیم کو صحیح قرار دے رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے تھے۔

تم پر حرام کر دی گئی ہیں[۵۱]۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی اُس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے[۵۲]۔"

جب عیسیٰ نے محسوس کیا[۵۳] کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا[۵۴] "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟" حواریوں[۵۵] نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں[۵۶]، ہم اللہ

۵۱؎ یعنی تمہارے جہلا کے توہمات، تمہارے فقیہوں کی قانونی موشگافیوں، تمہارے رہبانیت پسند لوگوں کے تشددات، اور غیر مسلم قوموں کے غلبہ و تسلط سے تمہارے ہاں اصل شریعتِ الٰہی پر جن قیود کا اضافہ ہو گیا ہے ان کو منسوخ کر دوں اور تمہارے لیے وہی چیزیں حلال اور وہی حرام قرار دوں جنھیں اللہ نے حلال یا حرام کیا ہے۔

۵۲؎ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکات یہی تین تھے: ایک یہ کہ اقتدارِ اعلیٰ جس کے مقابلہ میں بندگی کا رویّہ اختیار کیا جاتا ہے اور جس کے خوف پر اخلاق و تمدن کا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس مقتدرِ اعلیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔ تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرف اللہ کا ہو، دوسروں کے عائد کردہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں۔ پس درحقیقت حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں یک سرِ مو فرق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیے ہیں اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں کہ رعایا کو نافرمانی، خود مختاری اور شرک (یعنی اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھیرانے اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاریوں کو ان میں منقسم کرنے) سے منع کرے اور اصل مالک کی خالص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

۵۳؎ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کے جوان ہونے اور نبوت کا کام عملاً شروع کر دینے تک کے تمام واقعات بیچ میں چھوڑ کر اب اس وقت کا ذکر شروع کیا جاتا ہے جب بنی اسرائیل میں اُن کی (باقی اگلے صفحہ پر)

پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں، مالک! جو فرمان تو نے نازل کیا ہے ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے"۔

پھر بنی اسرائیل (مسیح کے خلاف) خفیہ تدبیریں کرنے لگے، جواب میں اللہ نے بھی اپنی
ع ۵ خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔[۵۰] (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی) جب اُس نے کہا کہ "اے عیسیٰ اب میں تجھے واپس لے لوں گا[۵۱] اور تجھ کو اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور

(بقیہ سابق) مخالفت شروع ہوئی۔

۴۹ "حواری" کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو ہمارے ہاں "انصار" کا مفہوم ہے۔

۵۰ دینِ اسلام کی اقامت میں حصہ لینے کو قرآن مجید میں اکثر مقامات پر "اللہ کی مدد کرنے" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے جس دائرے میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے، اس میں وہ انسان کو کفر یا ایمان، بغاوت یا اطاعت میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے پر اپنی خدائی طاقت سے مجبور نہیں کرتا بلکہ اسے دلیل اور نصیحت سے اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انکار و نافرمانی اور بغاوت کی آزادی رکھنے کے باوجود اس کے لیے حق یہی ہے اور اس کی فلاح و نجات کا راستہ بھی یہی ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ اس طرح فہمائش اور نصیحت سے بندوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، یہ دراصل اللہ کا کام ہے، اور جو بندے اس کام میں اللہ کے ساتھ شریک ہوں ان کو اللہ اپنا رفیق و مددگار قرار دیتا ہے، اور یہ وہ بلند سے بلند مقام ہے جس پر کسی بندے کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ نماز، روزہ اور تمام اقسام کی عبادات میں تو انسان محض بندہ و غلام ہوتا ہے، مگر تبلیغ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں بندے کو خدا کی رفاقت و مددگاری کا شرف حاصل ہوتا ہے جو اس دنیا میں روحانی ارتقاء کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۵۱ اصل میں لفظ "متوفیک" استعمال ہوا ہے۔ توفّی کے اصل معنی لینے اور وصول کرنے کے ہیں۔ "روح قبض کرنا" اس لفظ کا مجازی استعمال ہے نہ کہ اصل معنی موضوع لہ۔ یہاں یہ لفظ انگریزی لفظ (To recall) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے یعنی کسی عہدہ دار کو اس کے منصب سے واپس بلا لینا۔ چونکہ بنی اسرائیل (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے (ان کی معیت سے اور ان کے گندے ماحول میں ان کے ساتھ رہنے سے) تجھے پاک کردوں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک اُن لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنھوں نے تیرا انکار کیا ہے، پھر تم سب کو آخرکار میرے پاس آنا ہے

(بقیۂ سابق) صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تنبیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جارہی تھی، پے درپے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اُس بندۂ صالح کے خون کے پیاسے ہوجاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انھیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انھیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو جلیل القدر پیغمبروں کو بیک وقت معبوث کیا جن کے ساتھ مامور من اللہ ہونے کی ایسی کھلی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کرسکتے تھے جو حق وصداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جسارت و بے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر بنی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہ کیا کہ اِن دونوں پیغمبروں کی دعوت رد کردی، بلکہ ان کے ایک رئیس نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک رقاصہ کی فرمائش پر قربان کردیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کرکے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت اور قوت صرف کرنا بالکل فضول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلالیا اور قیامت تک کے لیے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر دراصل عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیت مسیح کی تردید واصلاح کے لیے ہے، اور عیسائیوں میں اس عقیدہ کے پیدا ہونے کا اہم ترین سبب حضرت مسیح کی اعجازی ولادت اور ان کے صریح محسوس ہونے والے معجزات کے بعد اُن کا آسمان کی طرف اُٹھایا جانا ہے جس کا ذکر صاف الفاظ میں ان کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ اگر عیسائیوں کی یہ روایت غلط ہوتی تو ان کے عقیدہ الوہیت کا اس سے بہتر کوئی رد نہ ہوسکتا تھا کہ ان سے صاف الفاظ میں کہا جاتا کہ جسے تم اِلٰہ اور ابن اللہ بنا رہے ہو وہ مرکر مٹی میں مل چکا ہے، مزید اطمینان چاہتے ہو تو فلاں مقام پر جاکر اس کی قبر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی موت کی تصریح نہیں کرتا اور صرف یہی نہیں کہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو زندہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اُس وقت میں اُن باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انھیں دنیا اور آخرت دونوں میں سخت سزا دوں گا اور وہ کوئی مدد گار نہ پائیں گے، اور جنھوں نے ایمان اور نیک عملی کا رویّہ اختیار کیا ہے انھیں اُن کے اجر پورے پورے دیے جائیں گے۔ اور خوب جان لے کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔"

یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمھیں سنا رہے ہیں۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اُسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اِس معاملہ میں تم سے

(بقیۂ سابق) اُٹھائے جانے کے مفہوم کا کم از کم احتمال تو رکھتے ہی ہیں، بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے، یعنی وہ جس نے آخری وقت میں ایلی ایلی لما شبقتانی کہا تھا اور وہ جس کی صلیب پر چڑھی ہوئی حالت کی تصویر تم لیے پھرتے ہو وہ مسیح نہ تھا، مسیح کو تو اس سے پہلے ہی خدا نے اٹھا لیا تھا۔ اس پر بھی جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیح کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

ملہ انکار کرنے والوں سے مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انھوں نے اُسے رد کر دیا تھا۔ بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو وہ صرف مسلمان ہیں، اور اگر اس سے مراد فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ملہ یہاں تک کی تقریر میں جو بنیادی نکات عیسائیوں کے سامنے پیش کیے گئے ہیں ان کا خلاصہ علی الترتیب حسب ذیل ہے:

پہلا امر جوان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمھارے اندر

(باقی اگلے صفحہ پر)

جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ "آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں
اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو"۔[۱] یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ
ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے، اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی
حکمت نظامِ عالم میں کارفرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ (اس شرط پر مقابلہ میں آنے سے) منہ موڑیں تو

(بقیہ سابق) جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے، ان میں سے کوئی وجہ بھی ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ہے۔ ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت مناسب سمجھا کہ غیر معمولی صورت سے پیدا کرے اور اسے ایسے معجزے عطا کرے جو نبوت کی صریح علامت ہوں، اور منکرینِ حق کو اسے صلیب پر نہ چڑھانے دے بلکہ اس کو اپنے پاس اُٹھا لے۔ مالک کو اختیار ہے، اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا، یا مالک کا بیٹا تھا، یا ملکیت میں اُس کا شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیحؑ جس چیز کی طرف دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں یک سرِ مُو فرق نہیں ہے۔

تیسرا بنیادی نکتہ اس تقریر کا یہ ہے کہ مسیح کے بعد ان کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی اور نہ اُس مذہب کی پیرو رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ وفدِ نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ اوپر کی تقریر میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی اُن لوگوں کے پاس نہ تھا۔ اور مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ خود اپنی کتب مقدسہ کی ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امرِ واقعہ کے عین مطابق ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہلِ وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے بھی قائل ہو چکے تھے یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو چکے تھے، اس لیے جب اُن سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو (باقی اگلے صفحہ پر)

(اُن کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔ ۶ع

کہو[۱]، اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے[۲]، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے ـــ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں ـــ

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں، پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے[۳] ـــ تم لوگ جن

(بقیہ سابق) کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو، تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا اور یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل گئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے، دراصل ایسے عقائد کا اتباع کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود انھیں کامل اعتماد نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں سے ایک تیسری تقریر شروع ہوتی ہے جس کے مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگِ بدر اور جنگِ اُحد کے درمیانی دور کی ہے۔ لیکن ان تینوں تقریروں کے درمیان مطالب کی ایسی قریبی مناسبت پائی جاتی ہے کہ شروع سورۃ سے لے کر یہاں تک کسی جگہ ربطِ کلام ٹوٹتا نظر نہیں آتا۔ اسی بنا پر بعض مفسرین کو شبہ ہوا ہے کہ یہ بعد کی آیات بھی وفدِ نجران والی تقریر ہی کے سلسلہ کی ہیں۔ مگر یہاں سے جو تقریر شروع ہو رہی ہے اس کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ اس کے مخاطب یہودی ہیں۔

[۲] یعنی ایک ایسے عقیدے پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمھارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے، تمھاری اپنی کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔

[۳] یعنی تمھاری یہ یہودیت اور یہ نصرانیت بہرحال توراۃ اور انجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئی ہیں اور

(باقی اگلے صفحہ پر)

چیزوں کا علم رکھتے ہو اُن میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب اُن معاملات میں کیوں بحث کرنے چلے ہو جن کا تمھارے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ سیدھا[۱] مسلم تھا اور شرک کرنے والوں میں ہرگز نہ تھا"۔ ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے اُس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اِس کے ماننے والے اِس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔

(اے ایمان لانے والو!) اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمھیں راہِ راست سے ہٹا دے، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انھیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہلِ کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو[۲]؟ اے اہلِ کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟

(بقیہ سابق) ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گذر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے وہ بہرحال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا، پھر اگر حضرت ابراہیم راہِ راست پر تھے اور نجات یافتہ تھے تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہِ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت کی پیروی پر موقوف نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] اصل میں لفظ حنیف استعمال ہوا ہے جس سے مراد ایسا شخص ہے جو ہر طرف سے رُخ پھیر کر یکسوئی کے ساتھ سیدھی راہ پر چلے۔

[۲] دوسرا ترجمہ اس فقرہ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "تم خود گواہی دیتے ہو"۔ دونوں صورتوں میں نفس معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات، اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہوتے تھے، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو گروہ انبیاء کے احوال اور کتبِ آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں[۵۵]۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔ اے نبی ان سے کہدو کہ "اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اُسی کی دین ہے کہ کسی کو وہی کچھ دیدیا جائے جو کبھی تم کو دیا گیا تھا، یا یہ کہ دوسروں کو تمھارے رب کے حضور پیش کرنے کے لیے تمھارے خلاف قوی حجت مل جائے"۔ اے نبی ان سے کہو کہ "فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر[۵۶] ہے اور سب کچھ جانتا ہے[۵۷]، اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے مخصوص کرلیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے"۔

(بقیہ سابق) نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل تھا چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہلِ کتاب (خصوصاً ان کے اہلِ علم) پہچان چکے تھے کہ حضور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیاء سابقین نے کیا تھا حتیٰ کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت اور آپ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کرگزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۵] یہ اُن چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطرافِ مدینہ کے رہنے والے یہودی قبائل کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو بددل کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عامۂ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کرکے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں، پھر مرتد ہو جائیں پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور اُن کے پیغمبر میں یہ اور یہ خرابیاں دیکھی ہیں۔

[۵۶] اصل میں لفظ "واسع" استعمال ہوا ہے جو بالعموم قرآن میں تین مواقع پر آیا کرتا ہے۔ ایک وہ موقعہ جہاں

(باقی اگلے صفحہ پر)

اہلِ کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمھارا مال تمھیں ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ اُن کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں "امیوں (غیر یہودی عربوں) کے معاملہ میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے[۶۳]"۔ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں اُن سے بازپرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور بُرائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ اُن سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا[۶۴]، بلکہ اُن

(بقیہ سابق) انسانوں کے کسی گروہ کی تنگ خیالی و تنگ نظری کا ذکر آتا ہے اور اُسے اس حقیقت پر متنبہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اللہ تمھاری طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ دوسرا وہ موقع جہاں کسی کے بخل اور تنگ دلی اور کم حوصلگی پر ملامت کرتے ہوئے یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ فراخ دست ہے، تمھاری طرح بخیل نہیں ہے۔ تیسرا وہ موقع جہاں لوگ اپنے تخیل کی تنگی کے سبب سے اللہ کی طرف کسی قسم کی محدودیت منسوب کرتے ہیں اور انھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ غیر محدود ہے۔

۶۲ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کون فضل و شرف کا مستحق ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۶۳ یعنی امانت اور دیانت کا لحاظ صرف یہودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے، غیر یہودی کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ عجب نہیں کہ کارِ ثواب ہو۔

۶۴ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے ایسے سخت اخلاقی جرائم کرنے کے بعد بھی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز بس یہی اللہ کے مقرب بندے ہوں گے، انھی کی طرف نظرِ عنایت ہوگی، جو تھوڑا بہت

(باقی اگلے صفحہ پر)

کے لیے تو سخت دردناک سزا ہے۔

اُن میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا

(بقیہ سابق) گناہوں کا میل دنیا میں ان کو لگ گیا ہے وہ بھی بزرگوں کے صدقے میں ان پر سے دھو ڈالا جائیگا حالانکہ دراصل وہاں ان کے ساتھ بالکل برعکس معاملہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎۱ اس کا مطلب اگرچہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں، یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکالتے ہیں، لیکن اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو، جو اُن کے مفاد یا اُن کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو، زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس کی نظیریں قرآن کو ماننے والے اہل کتاب میں بھی مفقود نہیں ہیں مثلاً بعض لوگ جو نبی کی بشریت کے منکر ہیں آیت قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ میں اِنَّمَا کو اِنَّ مَا پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "اے نبی کہدو کہ تحقیق نہیں ہوں میں بشر تم جیسا"۔

؎۲ یہودیوں کے ہاں جو علماء مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے اور جن کا کام مذہبی امور میں لوگوں کی رہنمائی کرنا اور عبادات کے قیام اور احکام دین کا اجراء کرنا ہوتا تھا، ان کے لیے لفظ ربانی استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ خود قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ

(باقی اگلے صفحہ پر)

۴۸

حکم دے جب کہ تم مسلم ہو؟[۵۱]

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمھارے پاس اُسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمھارے پاس موجود ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی[۵۲]۔" یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا "کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اُٹھاتے ہو؟" انھوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا "اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں، اِس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے[۵۳]۔"

(بقیہ حاشیہ سابق) اَكۡلِهِمُ السُّحۡتَ (ان کے ربانی اور ان کے علما ان کو گناہ کی باتیں کرنے اور حرام کے مال کھانے سے کیوں نہ روکتے تھے) اسی طرح عیسائیوں کے ہاں لفظ (Divine) بھی "ربانی" کا ہی ہم معنی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یہ اُن تمام غلط باتوں کی ایک جامع تردید ہے جو دنیا کی مختلف قوموں نے خدا کی طرف سے آئے ہوئے پیغمبروں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی رو سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبود قرار پاتا ہے۔ ان آیات میں یہ قاعدۂ کلیہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہو، ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے، سمجھ لو کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

[۵۲] مطلب یہ ہے کہ ہر پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے ــــ اور جو عہد پیغمبر سے لیا گیا ہو وہ لامحالہ اس کے پیرووں پر بھی آپ سے آپ عائد ہو جاتا ہے ــــ کہ جو نبی ہماری طرف سے اس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جائے جس کی تبلیغ و اقامت پر تم مامور ہوئے ہو، اس کا تمھیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب

(باقی اگلے صفحہ پر)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چاروناچار اُسی کی تابعِ فرمان (مسلم) ہیں[۱] اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے؟ اے نبی کہو کہ "ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں، اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے[۲] اور ہم اللہ کے تابعِ فرمان (مسلم) ہیں"۔ اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

(بقیہ سابق) نہ برتنا، اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ سمجھنا، حق کی مخالفت نہ کرنا، بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جائے اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

[۷۰] اس ارشاد سے مقصود اہلِ کتاب کو متنبہ کرنا ہے کہ تم اللہ کے عہد کو توڑ رہے ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار اور ان کی مخالفت کر کے اس میثاق کی خلاف ورزی کر رہے ہو جو تمہارے انبیاء سے لیا گیا تھا، لہٰذا اب تم فاسق ہو چکے ہو، یعنی اللہ کی اطاعت سے نکل گئے ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی تمام کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی ہے، اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کونسا طریقۂ زندگی (باقی صفحہ آئندہ پر)

کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ اُن لوگوں کو ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پا لینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسول حق پر ہے اور روشن نشانیاں لیکر آیا ہے[۵۹]؟ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ اُن پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی۔ البتہ وہ لوگ اس سے بچ جائیں گے جو توبہ کر کے اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا، پھر اپنے اس کفر میں بڑھتے چلے گئے[۶۰] ان کی توبہ بھی قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں۔ یقین رکھو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں جان دی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے رُوئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک سزا تیار ہے اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ پائیں گے۔ ع۹

(بقیہ سابق) تلاش کر رہے ہو۔

۵۸ یعنی ہمارا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی نبی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں کسی کو جھوٹا کہیں اور کسی کو سچا۔ ہم تعصب اور حمیتِ جاہلیہ سے پاک ہیں۔ دنیا میں جہاں جو اللہ کا بندہ بھی اللہ کی طرف سے حق لے کر آیا ہے، ہم اس کے برحق ہونے پر شہادت دیتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۹ یہاں پھر اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے جو اس سے قبل بارہا بیان کی جا چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب کے یہودی علماء جان چکے تھے اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ نبی برحق ہیں اور جو تعلیم آپ لائے ہیں وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کیا وہ محض تعصب، ضد اور دشمنی حق کی اس پرانی عادت کا نتیجہ تھا جس کے وہ صدیوں سے مجرم چلے آ رہے تھے۔

۶۰ یعنی صرف انکار ہی پر بس نہ کی بلکہ عملاً مخالفت و مزاحمت بھی کی، لوگوں کو خدا کے راستہ سے روکنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں، دلوں میں وسوسے ڈالے، اور ایسی سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں کہ نبی کا مشن کسی طرح کامیاب نہ ہونے پائے۔